مولانا عبدالقیوم حقانی

اجتماعی زندگی اور اس کے تقاضے

نقطۂ نظر کے اختلاف کے باوجود (جو ایک بالکل فطری اور قدرتی چیز ہے) اجتماعی زندگی کے کچھ آداب اور تقاضے ہیں جن کو ہمیں ہر نقطۂ اختلاف پر ملحوظ رکھنا اور پورا کرنا چاہیئے، یہ نہ صرف اسلام کی تعلیم اور شریعت کا حکم ہے، بلکہ فطرت سلیم اور انسانیت کی ان معروف و مسلم قدروں کا بھی مطالبہ ہے جن کو قرآن مجید میں "المعروف" سے بار بار تعبیر کیا گیا ہے، یعنی اچھائی کے ساتھ معقولیت و ہمدردی کے ساتھ، دستور کے مطابق۔

بدقسمتی سے ہم مسلمانوں میں یہ اوصاف ایک عرصہ سے مفقود ہوتے جا رہے ہیں، اگر ہم ان اوصاف کو دو مختصر لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اس کو اصول پسندی اور قوتِ برداشت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اسلام کی اجتماعی زندگی محض ظاہری رکھ رکھاؤ یا کسی ٹکنیک کا نام نہیں، اس میں ایک طرف اجتماعی فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے اور قوت برداشت سے کام لینے کی بھی تلقین ہے۔

سورۂ والعصر میں اسی حقیقت کو بہت آشکار اور واضح طریقہ پر بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

والعصر ان الانسان لفی خسر	قسم ہے زمانہ کی، بے شک انسان خسارہ میں ہیں سوائے
الا الذین امنوا وعملوا الصالحات	ان کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کیے اور ایک دوسرے
وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر	کو وصیت کی حق بات کی اور ایک دوسرے کی وصیت کی صبر کی۔

صبر ایک بہت وسیع لفظ ہے جس کا تعلق حقوق اللہ سے ہے۔ اور حقوق العباد سے بھی، اس کا اطلاق مختلف چیزوں پر ہوتا ہے، معصیت سے باز رہنا اور نفس کی لگام کو قابو میں رکھنا بھی صبر ہے، کڑوی بات سن لینا، یا اپنی بات نیچی کر لینا بھی صبر ہے، نکتہ چینی اور عیب جوئی سے پرہیز بھی صبر ہے۔ اپنے مزاج اور عادات کے خلاف کرنا بھی صبر ہے۔ غرض صبر کے ہزار پہلو ہیں اور ہر شخص ذرا سی توجہ سے یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس کو کس موقع پر کس قسم کے صبر کی ضرورت ہے۔ اجتماعی زندگی اور خاص طور پر ملّت کی فلاح و بہبود اسلام کی خدمت و حمایت اور انسانی ہمدردی کے کاموں میں صبر اور قوت برداشت کی جس قدر ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو اس کا تجربہ ہو چکا ہے لیکن گھر اور محلہ کی محدود اجتماعی

زندگی کے نشیب و فراز اور اس کی دشواریوں اور الجھنوں کو سامنے رکھ کر بھی ہر شخص کسی نہ کسی درجہ میں اس کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اجتماعی یا جماعتی زندگی کے ان پیچیدہ مسائل میں ہمارا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ کیا ہونا چاہیئے۔

ہم میں سے ہر شخص مخصوص جذبات و خیالات رکھتا ہے، نہ صرف اس کا طرز فکر اور مزاج بلکہ طرز کلام اور طرز نشست و برخاست بھی ایک دوسرے سے جدا ہے، جب یہ ایک طے شدہ حقیقت اور قانون قدرت ہے تو ہمیں اوّل روز سے یہ سوچ لینا چاہیئے کہ اس وادی میں قدم رکھنے کے بعد یہ اختلاف قدم قدم پر رونما ہوگا اور اس سے واسطہ بار بار پیش آئے گا۔

اس صبر اور قوت برداشت کی حد بھی اسلام نے مقرر کر دی ہے، مصالحت و تعاون، اور صبر و تحمل و ضبط کن جگہوں پر جائز ہے اور کن جگہوں پر ناجائز، وہ دائرہ کیا ہے جس میں ہم کو اپنے مسلک یا اپنے موقف سے سرمو انحراف نہ کرنا چاہیئے، ہمیں کس جگہ جمنا چاہیئے اور کس جگہ نہ جمنا چاہیئے، ان سب چیزوں کے لئے تواصوا بالحق کی روشنی قرآن مجید نے ہمارے ہاتھ میں دے دی ہے، جہاں حق و صداقت، اصول، و مبادی و بنیادی حقیقتوں اور سچائیوں کے مجروح ہونے کا خطرہ ہو، وہاں اپنے موقف پر اس طرح ثابت قدم رہنا چاہیئے کہ کوئی دباؤ یا ترغیب یا فریب ہم کو متزلزل نہ کر سکے، لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس اختلاف کے نتیجہ میں یہ بنیادی اصول و حقائق نہیں بلکہ ملت کا مفاد مجروح ہونے کا خطرہ ہے تو ہمیں اپنے موقف اور طرز عمل کو بدلنے میں ادنیٰ تردد بھی نہ ہونا چاہیئے، خواہ اس سے خود ہمارا مفاد مجروح ہو رہا ہو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مشہور واقعہ اس مسئلہ میں ہمارے لیے روشنی کا مینار ہے۔ حضرت علیؓ اس وقت تک یہودی پر حملہ آور رہے جب تک ان کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ حق کے لیے لڑ رہے ہیں لیکن جب اس نے ان کے منہ پر تھوک دیا تو قدرتی طور پر ان کو بہت غصہ آیا، لیکن اسی غصہ سے ان کو یہ احساس ہوا کہ اب وہ اس کو قتل کریں گے تو اپنے نفس کے لیے کریں گے، چنانچہ انہوں نے یہ کہہ کر اس کو چھوڑ دیا کہ پہلے میں حق کے لیے انتقام لے رہا تھا، لیکن اگر اب میں انتقام لوں گا تو وہ نفس کے لیے ہوگا، اس لیے میں تجھ کو چھوڑتا ہوں، حق اور نفس کی یہ سرحدیں یا لکیریں ہمیں اپنے اجتماعی کاموں میں بارہا ملتی اور گڈمڈ ہوتی نظر آئیں گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فاصل حدیں یا لکیریں خلط ملط نہیں ہوتیں بلکہ فراست ایمانی کی کمی کی وجہ سے ہم اس حد فاصل کو اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے۔

اگر ہم محض اس آیت کو مدنظر رکھیں اور اس کو اپنی زندگی اور جدوجہد کا شعار بنالیں۔

عسیٰ ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئا وھو شر لکم ۔

ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو بُرا سمجھو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو بہتر سمجھو اور وہ تمہارے لیے بُری ہو۔

تو ہمارے معمولی گھریلو مسئلوں اور روزمرہ کے معاملات سے لے کر بڑے بڑے اختلافی اور سیاسی مسائل خوش اسلوبی سے حل ہو سکتے ہیں۔

اختلاف اسی وقت بُری شکل اختیار کرتا ہے جب اغراض سے اغراض ٹکراتی ہیں، اگر اغراض کا یہ حصہ اس سے نکال دیا جائے تو ان سارے اختلافات کا خود خاتمہ ہو جائے گا جو ملّت اسلامیہ کو گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔ اور اس کی اصلاح اور پیش رفت میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئے ہیں۔

دوسروں کی خوبیوں کو پہچاننا ایک فن ہے اور ان کا کشادہ دلی سے اعتراف کرنا اس سے بڑا فن، عملی میدان میں قدم رکھنے کے بعد ہمیں اس فن پر ریاضت کی ضرورت ہے تاکہ تعاون کی راہیں ہموار ہو سکیں اس میں شک نہیں کہ اس وقت پورا عالم اسلام ان اختلافات کا شکار ہے لیکن ہندوستان کی وہ مظلوم ملّت جو مشترکہ مفاد میں اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ اس میں تفریق کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، جہاں سب جماعتیں اور ادارے اخبار اور رسالے ایک کشتی کے سوار ہیں اور سب کو ایک لاٹھی سے ہانکا جا رہا ہے، جہاں دینی و سیاسی قیادتوں کو مشترکہ مسائل کا سامنا ہے اور جہاں نئی اور تازہ دم قیادت اور ملّت کو نئی راہوں اور نئی منزلوں سے روشناس کرنے کی دعوت بے حد قوت برداشت استقامت اور فراخدلی چاہتی ہے وہاں انفرادی و شخصی اختلافات اور ذوق و مزاج کے فرق نیز مختلف مزاجوں اور طبیعتوں کو ساتھ لے کر کام کرنے کا فقدان، مختلف صلاحیتوں اور قابلیتوں کے افراد کا عدم اتحاد وقتی اور جذباتی مسئلوں پر انتہائی پسندی، اپنی رائے اپنے فیصلہ بلکہ اپنی خواہش، اپنے ذوق اور اپنے مزاج پر ضرورت سے زائد اعتماد، دوسروں کی رائے کو نظر انداز کرنے، یا ناقابل التفات سمجھنے کا رویہ، اور اپنے نقطۂ نظر کو پتھر کی لکیر سمجھنا ہماری اجتماعی زندگی کی وہ کمزوریاں ہیں جو اب روز روشن کی طرح عیاں ہیں، اور ان سے ملّت کے اہم ترین کاموں کو سخت نقصان پہونچ رہا ہے۔

یہ وہ مرض ہے جس میں کم و بیش ہم سب مبتلا ہیں، ہم سب تحت الشعور ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ حقیقت کی آخری تصویر اور مسئلہ کی اصل گرہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اور دوسرا اس مسئلہ کو ہم سے بہتر سمجھے یا اس معاملہ میں ہم سے اچھی رائے رکھنے سے قاصر ہے اور یہی وہ بنیادی غلطی ہے جس نے مسلمانوں کے اجتماعی کاموں کو ہمیشہ نقصان پہنچایا ہے۔

(بقیہ صـ۵۵ پر)